

الفاتحہ اُمّ الکتاب

از میر محمد حسین - ایم۔ اے (فاضل دیوبند)

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ ابو العالیہ اسے مکی بتاتے ہیں جب کہ حضرت ابو ہریرہ، مجاہد، عطاء بن یسار اور زہری اسے مدنی خیال کرتے ہیں۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے، وہ اتنا متوازن اور معتدل ہے کہ اس بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینا بہت مشکل ہے۔ خارجی شہادتوں کی بنیاد پر اگرچہ ہمیں — جیسا کہ علامہ قرطبی نے کہا ہے اس کا مکی ہونا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ سورۃ الحج (جو بالاتفاق مکی ہے) میں نبی علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْمَقْرَآنَ الْعَظِيمَ** اور ائمہ تفسیر کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سبع مثنائی اور قرآن عظیم سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔ نیز مکہ میں اول روز سے نماز ادا کی جا رہی تھی اور حضور کا ارشاد ہے کہ لا صلوة الا بفاتحة الكتاب اس سے لازم آتا ہے کہ سورۃ فاتحہ اس وقت مکہ میں نازل ہو چکی ہو۔

تاہم سورت کو اس کے مفہوم و مدعا کے لحاظ سے اگر بیک مکی و مدنی کہا جائے تو بھی یہ رائے بہت وقیع ہوگی کیونکہ مضامین کے لحاظ سے سورت کے چار حصے کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کے چار صفتی ناموں — رب العالمین، رحمن، رحیم اور ملک یوم الدین — کے سامنے۔

۲۔ بندے کا اقرار و اعلان کہ وہ صرف اور صرف اسی کی عبادت کرے گا اور صرف اسی سے ہر طرح کی انعامت و مدد طلب کرے گا۔

۳۔ اس صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا جو الحام یافتہ لوگوں کی راہ ہے۔

۴۔ مگر راہ اور غضب کا شکار ہونے والوں کی راہ سے بچنے کی دعا۔

اور قرآن مجید کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات انہی چار بنیادی صفات کا عکس و منظر بالآزمہ و متممہ ہیں۔ دوسری چیز جس پر قرآن مجید میں زور دیا گیا ہے وہ توحید ہے جس کا دو لفظوں میں خلاصہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ اور اپنی حاجات و ضروریات کے لیے صرف اور صرف اسی سے مدد مانگی جائے۔ اسی طرح قرآن مجید میں چارہ ہی قسم کے لوگوں کو خدا کا منعم بنایا گیا ہے، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جبکہ باقی عین افراد و اقوام — ہود، صالح، شعیب اور لوط علیہم السلام کہ تیسوں۔ بنی اسرائیل اور نصاریٰ — کا ذکر ہے۔ وہ سب کی سب مغضوب اور مگر راہ بتائی گئی ہیں، جن کی راہ کو خسار ہے اور ناکامی کی راہ بتایا گیا ہے۔

اسی طرح یہ سورت پر اسے قرآن کی تمہید و دیباچہ یا متن بھی ہے جو شروع میں آیا کرتا ہے اور اس کا خلاصہ و اختصار بھی جو آخر میں دیا جاتا ہے۔ سورت کے اس معجزانہ پہلو کو دیکھا جائے تو اسے بیک وقت کئی بھی کہا جاسکتا ہے اور مدنی بھی۔

خلاصہ و اختصار ہونے کی صورت میں تو ظاہر ہے کہ اس کتاب حکیم کے مطالعہ کے بعد جو احساس و تاثر قادی کے دل پر قائم ہونا چاہیے۔ وہ رب العالمین کی حمد و ثنا، اقرار و اعلان بندگی اور دُعائے ہدایت و رہنمائی کی صورت میں اسے تلقین کر دیا گیا تاکہ وہ اسے عمل میں لاکر یوم الدین کی پرستش سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکے۔

اور اگر اسے تمہید و فن قرار دیا جائے تو یہ اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ ایک نالی اللہ بن اور سلیم الفطرت انسان جب اپنے ارد گرد دشمن جہات میں پھیلی ہوئی کائنات پر غور کرتا ہے تو وہ نہ صرف اس کی ریاضاتی اُصولوں پر مبنی اور مہراز حکمت تخلیق پر حیران و ششدر

رہ جاتا ہے، بلکہ اس کے بنانے والے کی ربوبیت اور بے پایاں رحمت پر بے اختیار تعریف و توصیف بھی کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس نے صرف اس خلاصہ کائنات — انسان — ہی کی جسمانی و روحانی نشوونما اور ارتقاء کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان، زمینوں اور آسمانوں میں ودیعت نہیں کر دیا بلکہ دوسری تمام مخلوقات — حیوانات، نباتات اور جادات — تک کے نشوونما اور ارتقاء کے جلی و خفی اسباب مہیا کر دیئے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کھکیڑ محض کھیل اور نمائش کے لیے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا لازماً کوئی مقصد و مدعا ہو گا اور وہ اس شعور و اختیار کا مل رکھنے والی مخلوق — انسان — کے جذبہ تشکر و امتنان کی آزمائش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے چنانچہ وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ ایاک نعبد کہ ”اے رب کائنات! ہم تیری اس بے پایاں رحمت پر مبنی ربوبیت کے سامنے اپنا سر نیاز مند ہی خم کر رہے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں تیرے ہی بندے بن کر رہیں گے“

رب کائنات کا جو وجود غور و فکر سے پہلے غیاب و حجاب میں تھا۔ تدبر و تفکر کے نتیجہ میں اب گویا اس کے لیے مشہور و محسوس بن گیا ہے۔ اس لیے اب وہ اس سے بصیغہ خطاب مخاطب ہوتا ہے۔

چونکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس رب العالمین نے انسان کی تمام مادی و روحانی ضرورتوں کا پہلے سے بندوبست کر رکھا ہے وہ اس کی آئندہ ضرورتوں کو بھی لازماً کفیل ہو گا اس لیے معاً اس کے دل سے یہ صدا بھی اٹھتی ہے کہ ایاک نستعین کہ ”اے رب کائنات! ہم تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنی تمام حاجات اور آرزوؤں کے لیے صرف اور صرف تجھی سے اعانت و مدد کے طلب گار ہوں گے“

ان دو جملوں میں اگرچہ حصر موجود ہے جس سے ماسوائے اللہ کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے مگر بالضراحت غیر اللہ کی نفی نہ کرنے میں حکمت یہ نظر آتی ہے کہ کائنات کا مطالعہ کرنے والے سلیم الفطرت انسان کا مل اللہ سے جس قدر قریب ہوتا ہے، وہ صرف رب العالمین کے لیے

اپنی بندگی اور صرف اسی سے استعانت کا اظہار ہے جو اگرچہ نفی ماسویٰ کو متضمن ہے تاہم ابھی اس کا ذہن کسی ماسویٰ اللہ کی طرف بالقصد متوجہ نہیں۔ اس لیے اس کی بالصراحت نفی کی ضرورت نہ تھی۔ توحید انسان کی فطرت کی آرزو ہے۔ شرک کی آمیزش بعد میں اور خارجی عوامل کی وجہ سے ہوئی۔ اس لیے اس کی نفی اور تردید کی ضرورت بھی بعد میں پیش آئی۔ یہاں تک رب العالمین سے انسان کی وابستگی ذہنی و فکری حد تک تھی، لیکن اسے معلوم ہے کہ عمل کی دنیا میں بہت سی ترغیبات و مشکلات ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اسے بندگی کی اس راہ سے ہٹا دیں یا اسے اس عہد سے منحرف کر دیں یا اسے فکر و ذہنی الجھن میں ڈال دیں جیسا کہ تاریخ میں ہو چکا ہے، اس لیے معاً بعد اس سے یوں عملی استعانت کرتا ہے کہ وہ اسے ہمیشہ صراط مستقیم پر چلتا رکھے، بس پر اسے رب کائنات! تیرے بندے چل کر انعام یافتہ ٹھہرے اور عملی و فکری گمراہیوں سے محفوظ رہے اور پھر اس رحمن و رحیم رب العالمین نے فوراً جواب دیا کہ وہ صراط مستقیم ہماری یہ کتاب ہے، جس کے ہدایت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں (البقرہ) صیغہ جمع میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ صدا پوری نوع انسانی کی فطرتِ سلبہ کی صدا ہے۔

قرآن مجید میں رحمن و رحیم ہر دو الفاظ کے استعمال کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ رحمن اپنے مبانی (حروف) کی کثرت کی طرح اپنے معانی میں بھی وسعت لیے ہوئے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی اس وسیع رحمت کے لیے استعمال ہوا ہے جو تمام انسانوں — قطع نظر اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مومن — پر محیط ہے اور جس کے بغیر انسان نہ انسان ہو سکتا تھا اور نہ وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا یا اس کائنات میں ترقی و ارتقاء کے منازل طے کر سکتا تھا۔ اس وسیع رحمت سے مراد رب العالمین کی عطا کردہ وہ تمام مادی ذہنی اور روحانی نعمتیں ہیں جو اس نے انسان کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیل رکھی ہیں قرآن مجید میں جابجا ان کا حوالہ دے کر انسان کو اس کے انکار، اس سے بغاوت یا اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے سے باز رہنے کو کہا گیا ہے۔

قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے ظاہر ہو گا کہ لفظ رحیم نسبتاً محدود معنوں میں استعمال

ہوا ہے اور عموماً اس سے مراد خدائے کائنات کی وہ رحمت لی جاتی ہے جس کی بدولت وہ انسان کو اس کی بغاوت و سرکشی سے باز آ جانے پر معاف کر دیتا یا اس کے ساتھ دوسرے درست ہونے پر اس کی لغزشوں یا مجبوریوں سے درگزر کرتا، اسے سہولتیں بہم پہنچاتا یا اس کی سرکشی کے باوجود اس پر فوراً گرفت نہیں کرتا، بلکہ اسے مہلت اور ڈھیل دے دیتا ہے۔

سورۃ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد صفت الرحمن کا ذکر کرنے سے انسان پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس رب العالمین نے اپنی گونا گوں مخلوق کی تخلیق، اس کے بقا کی تمام ضروریات اور اس کے ارتقاء کے تمام لوازمات جو مہیا کیے ہیں تو معنی اپنی رحمت و اسد و عامہ کی وجہ سے کیے ہیں۔ یکسی کا استحقاق یا کسی کی کاوش کا ثمرہ و نتیجہ نہیں۔

ساتھ ہی اپنی رحمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف لفظ الرحیم لاکر اشارہ فرمادیا کہ بہر حال آفرینش کا یہ سلسلہ بے مقصد و مہمل نہیں، بلکہ اس کی ایک غرض و غایت ہے اور وہ انسان کے جذبہ تشکر و امتنان کا امتحان ہے۔ اگر انسان نے اس کا ثبوت دیا تو ان دنیوی نعمتوں کے علاوہ وہ اسے اخروی نعمتوں سے بھی نوازے گا۔ اور اس کی خوشنودی و رضا اس پر مستزاد ہوگی اور اگر اس نے بغاوت و ناشکری کی راہ اختیار کی تو اسے توہ اصلاح کا موقع بھی مہیا کیا جائے گا، لیکن اس کی مہیا کردہ ان تمام سہولتوں، آسائشوں اور نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اگر وہ اپنی باغیانہ روش پر اڑا رہا تو پھر اسے پورم جزا کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ پوری طرح اس کی گرفت میں ہوگا اور اسے اپنی اس روش کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔

سورت کا مرکزی مدعا و مفہوم خدا کے نیک بندوں کی راہ پر چلنے کی آرزو و تمنا ہے، جس کا اظہار بندہ اپنے رب کے انعامات کی آمیہ اور اس کی گرفت و عتاب کے خوف کے ساتھ میں اپنی اسی کے ساتھ وابستگی کے اقرار و اعدن کے بعد کرتا ہے کیونکہ نعمت اسلام سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایک مسلمان کو روزمرہ کی زندگی میں گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی — ہر روز ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں

اگر خدا کی دستگیری حاصل نہ ہوتو وہ کسی بھی وقت راہ راست سے بھٹک سکتا ہے۔ بہ نماز میں اس دعا کے اعادہ و تکرار کی یہ حکمت و رلم معلوم ہوتی ہے۔

سورت جہاں اپنے مضامین و مشتملات کے اعتبار سے بایں معنی معجزہ ہے کہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے تمام مضامین اس میں سمٹ آتے ہیں، وہاں اپنے الفاظ، ان کی بندش اور اسلوب کے لحاظ سے اس کو ہمیں متقن کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں وارد تقریباً ۷۰ الفاظ ہیں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو عربی اور اردو ہر دو زبانوں کے روزمرہ میں استعمال نہ ہوتا ہو اور جس کے مفہوم میں کسی قسم کا اشکال و غلط فہمی یا پیچیدگی ہو مگر اس کے باوجود ان الفاظ سے انتہائیں جمیل، سہل اور جامع کلام ترکیب دینا جو ایک پوری کتاب کے مضامین کو اپنے اندر سمو لے، انسانی استطاعت سے باہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی حیثیت ایک نغمہ اور بیج کی سی ہے اور باقی سارے قرآن کی ایک شجرہ طیبہ کی سی۔ جس طرح درخت کی ابتدا ایک بیج سے ہوتی ہے اور پھر آخر میں اس پر لگتا بھی بیج ہی ہے، جس سے اس خلاق عالم کی شان ہویب دئی و یحید کا اظہار ہوتا ہے۔ سی طرح قرآن مجید کا شجرہ طیبہ پھوٹا بھی سورہ فاتحہ سے ہے اور اس کی شاخ طوبی پر بیج بھی اسی سورہ فاتحہ کا لگا۔ اسی لیے اسے بجا طور پر اتم الکتاب یا اتم القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي الْاَوَّلٰى وَالْاٰخِرَةِ۔

خواتین	۱۔ شمع حرم	محمد یوسف اصلاحی	۱۲/- روپے
کیلیے	۲۔ عورت اور اسلام	جلال الدین عمر	۹/-
تین	۳۔ عورت قرآن کی نظر میں	غنیہ محسن	۱۲/-
نویسٹر			
کتابیں	ایڈس پیلی کیشنز - ۴۳ - راحت مارکیٹ - اردو بازار لاہور		